نرم ہو کر دو حصوں میں لٹکی اور میز پر گر گئی۔

"تم صرف یہ بتا دو کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اوپر کرتے ہو، نیچے کرتے ہ درمیان میں کرتے ہو؟ —"

مشاہد کچھ کچھ سمجھا کہ منٹو صاحب کیا کہہ رہے اور اُس کے کانوں کی لویں سُرخ گئیں اور بدن ٹھنڈا ہو گیا — وہ اپنے بارے میں تو کچھ کچھ جانتا تھا اور اپنے جسم آگاہ تھا اور اکثر وہ صبح سویرے دیر تک بستر میں لیٹا رہتا کہ سب لوگ چلے جائیں تو اُٹھے۔ کبھی تو حالات ذرا آکورڈ سے ہوتے اور کبھی آکورڈ ہونے کے بعد جس موسموں کی چپ چپ ایسے ہوتے۔ لیکن اُس نے آج تک اپنے بہت ہی جنگلی خوابوں بھی سمیعہ کو کسی پوزیشن میں نہیں سوچا تھا — سوچتا بھی کیسے وہ تو ابھی تک یہی سمجھتا کہ بطخیں بھی پریگننٹ ہوتی ہیں... اور ادھر منٹو صاحب سخت بُرے آدمی، اس دو میں، شیرازی ہوٹل میں، جب کہ پیسٹری میز پر گر چکی تھی اور اُس کی اُنگلیوں پر لگی کریم ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی — اُنہوں نے اوپر نیچے اور درمیان کی رٹ لگا رکھی تھی۔ اُ کی آنکھوں میں جو کہ موٹی موٹی تھیں آنسو آ گئے... پہلا آنسو پیسٹری کے آدھے ٹکڑ پر گرا —

"اوئے —" منٹو صاحب نے صرف اتنا کہا اور ذرا حیران ہوئے۔

"میں جاؤں جی —"

اور بالکل غیر متوقع طور پر منٹو صاحب نے کہا — "جاؤ —"

"پلیز جی —" اُس نے دہی والا کٹورا اُٹھاتے ہوئے کہا "خط دے دیں —"

"جب بتاؤ گے کہ سمیعہ کے ساتھ کیا کرتے ہو تب ملے گا۔ ابھی یہ یہیں رہے اُنہوں نے کُرتے کی جیب کو تھپکا جس میں، مشاہد پیارے میں تم پر مرتی ہوں — اُ پہنچ سے دور ہو چکا تھا۔

وہ روتا ہوا، اُنگلیاں چاٹتا ہوا گھر واپس چلا گیا اور آپا جی سے کہہ دیا کہ گرمی تھی اس لیے آج دہی جم نہیں سکا —

وہ اب مستقل خدشوں میں گھرا رہتا اور اُسے بخار سا محسوس ہوتا۔ جب کبھی آپا جی یا ابا جی کا سامنا کرتا تو اُن کی نظروں میں، مشاہد پیارے میں تم پر مرتی ہوں، تلا کرتا... اُسے یقین تھا کہ وہ دنیا کا بد قسمت ترین لڑکا ہے —

اُسے منٹو صاحب سے نفرت ہو گئی۔ بڑی شدید قسم کی —

اُن دنوں ریگل چوک سے چیئرنگ کراس تک کی شاموں میں، چینی ہا پسن شوز لنڈن ہاؤس کے سُوٹوں اور رینکن کی ٹائیوں میں — گولڈ فلیک کے ٹینوں میں اور آئرن مور کے تمباکو میں — فراسٹی مالٹی آئس کریم میں، راجہ وائن سٹور میں، سٹینڈرڈز کی چھت پر، ایم یاسین خان کی بیکری میں، امپیریل شوز اور مینزل ریکٹس اور زیدی فوٹو گرافر کے اندر اور مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے صاحب لوگوں اور — لکشمی مینشن کے کراؤڈ کی زندگی میں یکدم ہلچل سی مچ گئی۔ زندگی وہ نہ رہی جو کہ گرم دوپہروں میں، میٹنی شوز اور فلیٹوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر گذرتی تھی —

پہلے تو اطمینان اور ٹھہراؤ تھا۔

بیرٹ کی نازک اور لڑکھڑاتی بیٹیاں، روشن اور پے ماسٹر خاندان پارسی تہواروں کے موقع پر اپنے گھروں کی سیڑھیوں کو رنگین چاکوں کے سفوف سے بنائے ہوئے بیل بوٹوں سے سجاتے... فرش پر ٹھپے لگا کر بہت دل کو کھینچنے والے نقش و نگار بناتے اور لوگ کئی روز تک ان منقش سیڑھیوں پر بیٹھنے سے گریز کرتے رہتے اور پھر وہ دھوپ سے مدھم ہو جاتے! بارش سفوف کے ذرّے بہا لے جاتی... پتلی پتنگ عیسائی لڑکی لوما کا ماموں ہیرس اگرچہ شاہد کے بلاک میں رہتا تھا لیکن اُس کی اصل رہائش ایف جے کنگ بار میں ہوتی تھی۔ اس شراب خانے کا عقبی دروازہ مینشن میں کھلتا تھا لیکن داخلہ ہال روڈ کی جانب تھا۔ ایف جے کنگ بار مینشن کراؤڈ کی بہت فیورٹ تھی.. صرف اس لئے کہ اس کا داخلہ کاؤ بوائے رز کی طرح کا تھا — سینے کی سطح پر دو ایسے پٹ جو دھکیلنے سے کھل جاتے اور پھر اپنے پرنگوں کے زور پر واپس آ جاتے — لیکن کراؤڈ میں سے اُس کے اندر کوئی نہیں گیا تھا۔ یک بار پیٹر اور ہیرس نے اپنے گورکھا ہیٹ ترچھے کر کے اِس کے داخلے کے سامنے تصویر کھنچوانے کی کوشش کی لیکن اُن کے ڈیڈی نے دیکھ لیا اور ڈیڈی عین اُس وقت بار میں سے نکل رہے تھے تو اُنہوں نے ان دونوں کو خوب ہینگ دی کہ باسٹرڈز آج فوٹو کھنچواتے کل اندر چلے جاؤ گے —

ماموں ہیرس ایف جے کنگ بار میں ہال روڈ کی جانب سے داخل ہوتا اور نہایت نرز چال سے داخل ہوتا اور پھر مینشن کی گلی میں کھلتے عقبی دروازے میں سے دھکے دے

کر باہر نکال دیا جاتا — کیونکہ ماموں ہیرس اپنی ڈرنک ہولڈ نہیں کر سکتا تھا اور پھر و میں کھڑے ہو کر شور مچاتا کہ آؤ اور مجھے مارو — چنانچہ مینشن کے باشندے اُس کی معصوم خواہش کا احترام کرتے اور اُسے مشترکہ طور پر زدوکوب کرتے.. اور یہ روزا معمول تھا۔

اُن دنوں ٹڈی دل بہت آتے تھے۔ صرف کھُلی آبادیوں اور کھیتوں پر ہی شہروں کے آسمان بھی اُن سے ڈھک جاتے تھے اور جب کبھی ٹڈیوں کے یہ بادل لاہو آسمان کی روشنی پر اپنی متحرک سیاہ چادر ڈالتے تو مشاہد کے فلیٹ کے عین سامنے رہ لاری خاندان ہاتھوں میں بیڈمنٹن ریکٹ پکڑے چھت پر آ جاتا اور اُچھل اُچھل کر ٹڈیو شکار کرنے لگتا۔ شام کو اِن ٹڈیوں کو سرسوں کے تیل میں فرائی کرنے سے جو بُو مشاہ فلیٹ کے اندر تک جاتی تو اُس کی آپا جی ناک پر ململ کا دوپٹہ ڈالے اُن مہاجروں کو کو جو دیسی گھی کی بجائے کھانے میں تیل استعمال کرتے تھے اور جو ٹڈیوں ایسی مکروہ شوق سے نوش کرتے تھے... ویسے لاری خاندان کے دو بچے ہاتھی دانت اور ٹومیٹو اُس دوست تھے — بہت برس بعد جب بڑے لاری صاحب ایک شام اُن کے فلیٹ کا در تادیر کھٹکھٹاتے رہے اور جب اُس کے ابا جی نے دروازہ کھول کر بڑے غصے سے کہا تھ فرمایئے تو اُنہوں نے ایک کارڈ اُن کو تھماتے ہوئے کہا تھا... ماشا اللہ سے ہاتھی دان شادی کر رہا ہوں، ضرور تشریف لایئے گا — ہاتھی دانت آپ کا بھی تو بچہ ہے۔

ابا جی نے لاری صاحب کو دیکھ کر اس لیے غصے کا اظہار کیا تھا کیونکہ وہ شام جب بھی مینشن لوٹتے تو قدرے ٹُن ہوتے اور اکثر دوسروں کے دروازوں پر دستک کر کہتے، ہاتھی دانت کی اماں دروازہ کھولو — لاری صاحب آ گئے ہیں۔

مظہر شاہ صاحب سلطان اور سلطانہ کے فلیٹ کے نیچے واقع ایک گیراج میں پذیر تھے... اور مینشن کراؤڈ خاص طور پر اُن پر نظر رکھتا تھا کیونکہ گرم دوپہروں میں جب سُو ہو کا عالم ہوتا تھا تو کوئلہ چننے والی خانہ بدوش لڑکیاں اُن کے گیراج کے نواح میں حیرت انگیز طور پر غائب ہو جاتیں.. بلکہ ایک غائب ہو جاتی اور ایک باہر بیٹھ کر انتظار اِنہی شاہ صاحب کے ساتھ ایک خاص وقت میں ایک خاص مدت میں منٹو صاحب گاڑھی دوستی ہو گئی.. پھر ایک شام اُس گیراج کی مکمل تنہائی میں جس میں دروازے نہیں تھے بیئر کی آخری بوتل کے بعد شاہ صاحب نے اپنے لائف ٹائم

اقرار کر لیا... میں کابل میں کاروبار کرتا تھا اور وہ شاہی خاندان کی شہزادی تھی — میری پہنچ سے باہر — میرے بس سے باہر اور میں اُس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔ تب مجھے ایک نسخہ ملا۔ سات رنگ کے پھول، ہفتے کے ساتویں دن میں نے اُسے سنگھا دیئے — اور پھر منٹو صاحب اُس رات...

منٹو صاحب نے یہ کہانی جوں کی توں لکھ کر "نقوش" میں چھپوا دی اور لکشمی مینشن میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا — اچھا تو سات پھولوں والے شاہ جی اس گیراج میں رہتے ہیں — ذرا دستک دے کر اُن سے ملاقات کریں — معاف کیجئے گا آپ ہی وہ شاہ صاحب ہیں جو منٹو کی کہانی —

اور شاہ صاحب برس پڑتے — اوئے میں منٹو کی — میں اُس.... منٹو کو —

ایک عرصے تک منٹو نے شاہ صاحب کے سامنے آنے سے گریز کیا۔

شاہ صاحب بے چارے بدنام ہو گئے تھے اور اب کوئلہ چننے والیوں سے بھی پرہیز کرتے تھے۔

مشاہد کو اس داستان کا علم تھا اور اسی لیے اُس نے شیرازی ہوٹل کی پیسٹریوں کی رشوت کے باوجود سمیعہ کے اوپر نیچے اور درمیان کی کوئی بات منٹو صاحب سے نہیں کہی تھی —

ویسے عشق تو اور بھی تھے —

کاروں کی بیٹریاں چارج کرنے والے عاشق مرزا اور دارو کا عشق —

کانی اور صاحب کا عشق — کانی ایک گھریلو سی لڑکی تھی، مسلمان تھی اور صاحب یک مڈل ایجڈ اینگلو انڈین صاحب تھا۔ کرسچن تھا... یہ ایک عجیب سمجھ میں نہ آنے والا عشق فایا شائد گہرے اور فنا کر دینے والے عشق کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ سمجھ میں میں آتا — صاحب کی سائڈ برنز بالکل سفید تھیں اور وہ روزانہ مخمور ہو کر کانی کے گھر کے نیچے جا کھڑا ہوتا — یہ بھائیوں کے لیے بے عزتی کی بات تھی — اور وہ اُسے بہت رتے۔ صاحب اطمینان سے مار کھا لیتا، منہ سے کچھ نہ کہتا — کچھ نہ بولتا اور زخم سہلاتا یک ویران گھر میں چلا جاتا۔ اور دوسرے روز پھر آ جاتا۔

کسی نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مسئلہ کانی کے مسلمان اور صاحب کے کرسچن ونے میں بھی ہو سکتا ہے — مسئلہ صرف عشق کا تھا —

کمال دن رات کنیز کو لو لیٹر لکھتا۔

اگرچہ صادق لکشمی مینشن کا رکھوالا تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے پر کڑی رکھتا۔ مینشن بقول اُس کے ایک خاندان تھا جس میں مسلمان پارسی ہندو اور کرسچین برابر کے حقوق رکھتے تھے.. لیکن کچھ لوگ اُس کی اجازت سے مینشن میں آ جاتے تھے ان میں ایم یاسین خان بیکری والوں کا منحنی سالڑکا سعید تھا جو گفتگو کے دوران "کنے" بہت استعمال کرتا... میرے کنے چیز کے ڈبے ہیں — میرے کنے کچھ سیکرٹس ہیں وغیرہ وہ اپنی دوکان سے، دادا سے چوری چوری انگریزی چاکلیٹ اور خوراک کے ٹین لاتا مینشن کراؤڈ اُس کا بے حد شکر گذار ہوتا۔ بنڈن روڈ کی جانب سے مشتاق داکو بھی آتا چاندنی راتوں میں جب وہ ہیمنت کمار کے رنگ میں "یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں" الا مینشن کی بالکونیاں آباد ہو جاتیں اور اُن سے پھولوں کے گجرے نیچے گرتے — گائیک کے خون میں تھی۔ وہ ہمیں بتایا کرتا تھا کہ میرے بڑے بھائی بہت زبردست موسیقا اور قسمت آزمائی کے لیے بمبئی چلے گئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنا فلمی نام خیام رکھ لیا ہے روشن کے بھائی فیروز کو سب لوگ فیروز ہنسی کہتے تھے.. وہ ہنستا بہت تھا۔

ٹریور جس کی رگوں میں سو فیصدی خالص یارکشائری خون دوڑتا تھا مینشن کا گورا بچہ تھا اور اُس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔

اُنہی دنوں ہال روڈ پر رہنے والے روندر نے اپنا نام افتخار رکھ کر مسلمان ہو اعلان کر دیا.. اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ اب اُس کے باپو اور تمام ہندو رشتے دار جائداد پر اُس کا حق ہے..

مال روڈ پر جب پہلی بار سُرخ ڈبل ڈیکر بس کا نزول ہوا تو ریگل کے تانگہ سٹینڈ کھڑے تانگوں کے شانت گھوڑے اُسے دیکھ کر ہراساں ہو گئے اور ہنہنانے لگے — خورشید شاہد کی بناوٹ اور سجاوٹ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور اُن کے جانا لگا رہتا تھا..

دوپہر کو ہال روڈ ایسے ویران ہوتی جیسے صحرائے گوبی کے کنارے پر واقع ہو مال روڈ پر بھی کوئی تانگہ بہت مدت بعد گذرتا اور گھوڑے کے گلے میں گھنٹیوں کی چھن چھن دیر تک گرم لُو میں معلق رہتی۔

بس لاہور کے یہی وہ دن تھے — جب ریگل چوک سے چیئرنگ کراس کی

میں.. مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے صاحب لوگوں کی زندگی وہ نہ رہی جو کہ گرم دوپہروں میں
— مینی شوز اور فلیٹوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر گذرتی تھی — لکشمی مینشن کے کراوڈ کی
زندگی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

لاہور کے اسی اطمینان اور ٹھہراؤ اور سادہ دلی میں ایک گاڑی بھوانی جنکشن رُکی —

اس ریل گاڑی میں اُن سب کے، خاص طور پر مینشن کراؤڈ کے خواب۔ اُنھوں نے کلی منجاروز کی برفوں کے سائے میں دیکھے تھے۔ اس میں ایک کومل پاؤں — ننگے پاؤں والی کوٹیسا تھی۔ ہیمنگ وے کے ناول "فی اسٹا" کی ہیروئن تھی جو کے میلہ سان فرمان میں ایک بُل فائٹر کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو برباد کر — اِسی گاڑی میں "سکاراموچ" تھا اور "وائلڈ نارتھ" تھا —

مشاہد سکول سے پیدل واپس آ رہا تھا — پیدل اس لیے کہ وہ اب تک تیر ریلے سائیکلیں گُم کر چکا تھا اور اُس کے ابا جی نے کہا تھا کہ جب تک تم خود سائیکل نہیں سیکھ جاتے تمہیں چوتھی سائیکل نہیں مل سکتی۔

وہ اُن لوگوں کو دنیا کے قابل ترین افراد گردانتا تھا جو ایک دو پہیوں والی سائیکل پر سوار ہو کر مسلسل پیڈل بھی مارتے تھے اور ہینڈل کا دھیان بھی رکھتے تھے — سڑک پر آنے جانے والی دوسری سائیکلوں اور تانگوں سے بچتے بھی تھے اور دھڑام سے گرتے نہیں تھے۔ وہ اُنھیں انتہائی احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اُس ماموں علی احمد نے اُسے متعدد بار منٹو پارک میں لے جا کر سائیکل چلانے کے رمز آشنا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن — مشاہد کو یقین تھا کہ وہ مرتے دم تک یہ کام نہ سکتا۔

تو پھر وہ اُن تین سائیکلوں کو کیا کرتا تھا جو باری باری اُس نے گُم کر دی تھیں اس کا جواب بہت سادہ ہے — اُس نے ڈرائیور رکھ لیے تھے۔

وہ صبح سویرے آپا جی کے ہاتھ کا بنا ہوا دیسی گھی کا تہہ دار پراٹھا کھا کر فلیٹ نیچے آتا تو وہاں، ڈرائیور نمبر ایک — کمال — اُس کا منتظر ہوتا...

سکول میں چھٹی ہوتی تو اُس کا ہم جماعت نسیم اُس سے پہلے سائیکل سٹینڈ پر پہنچ کر ایک نیلے رنگ کے غلیظ رومال سے سائیکل کا ڈنڈا صاف کر رہا ہوتا — یہ ڈرائیور نمبر دو تھا — دراصل انہی ڈرائیوروں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ سائیکلیں پے در پے چوری ہو گئیں۔

چنانچہ مشاہد مسلم ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب سے دو درجن بید اپنی ہتھیلیوں پر وصول کر کے پیدل واپس آ رہا تھا — اور چھوٹا مردان بھی اُس کے ہمراہ تھا... آپاجی زبردستی اُسے ساتھ بھیج دیتیں اور اُن کا وہی خدشہ کہ تیسری منزل پر واقع فلیٹ میں مسلسل رہنے سے بچے کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جائیں گی — اِس لیے مشاہد بیٹے اِسے کبھی کبھار ساتھ لے جایا کرو تاکہ اِس کی ٹانگیں کھلتی رہیں۔

قابل فہم طور پر دو درجن بید کھانے کے بعد، پیدل چلتے ہوئے اور مردان کو ہمراہ گھسیٹتے ہوئے مشاہد کا مزاج کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔

ریگل بس سٹاپ کے قریب مال روڈ کے ویران فٹ پاتھ پر — ایک غیر ملکی جوڑا چلا آ رہا تھا۔ مشاہد نے بغیر تجسّس کے اُن کی جانب ایک نگاہ کی اور اُس کے دِل کو دھچکا سا لگا — جیسے ٹرین میں بیٹھے ہوئے یکلخت بریک لگنے سے جسم کو لگتا ہے... وہ اس نیلی آنکھوں والی بلند قامت اور بے حد دودھیا پنڈلیوں والی عورت کو جانتا تھا اور بہت قریب سے جانتا تھا۔ اتنی دیر میں وہ قریب سے گذر گئی... اُس کے ذہن میں ایک اُلجھاؤ سا تھا۔ وہ ہوبہو وُہی لگتی تھی لیکن — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

فلیٹ کے دروازے کے قریب پہنچ کر مشاہد نے اپنا بستہ مردان کے حوالے کیا اور اُسے فوری طور پر تیسری منزل تک جانے والی باون سیڑھیوں کو طے کرنے پر معمور کیا اور خود تیز تیز چلتا مینشن کی گراؤنڈ میں آ گیا — کراؤڈ یہاں پہلے سے موجود تھا —

"ناہ —" پیٹر نے اپنا گورکھا ہیٹ مزید ترچھا کر کے منہ بگاڑ کر کہا۔

"نو وے —" ہیرس نے چٹکی بجائی —

کمال بھی پہنچ گیا — نہیں یار —

"ناہ۔ ناہ —" پیٹر سخت بیزار تھا۔ "تم نے پہلے بھی ایک مرتبہ مال پر دوڑ لگوائی تھی کہ جی گروچو مارکس جا رہا ہے — مُش اگر وہ وہی ہو جو تم کہتے ہو تو کرائسٹ میں ڈِنگا ... بلڈنگ کے سنہری کلس پر جا بیٹھوں گا — اور تمہیں پتہ ہے وہ کلس کتنا شارپ

ہے۔"

"مجھے وہی لگتی ہے —" مشاہد نے اب قدرے بجھے دل سے کہا کیونکہ
اُس کلس پر بیٹھنے کا رِسک لے سکتا تھا تو وہ یقیناً وہ نہیں تھی — کوئی اور تھی۔

"ہے گائیز —" کمال نے اپنی ڈھیلی نیکر میں انگوٹھے اُڑس کر اسے اپنے
کولہوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی "کم آن — لیٹ اَس چیک اِٹ مین —"

ان چاروں مسکیٹیرز نے احتیاطاً" آٹوگراف بکس بھی جیبوں میں ڈال لیں ا
سپاٹ کی جانب روانہ ہو گئے جہاں بقول مُش وہ آخری مرتبہ ایک لمبے تڑنگے مش
انگریز کی بانہوں میں بانہیں ڈالے نیلی آنکھوں کے ساتھ ہنستی ہوئی دیکھی گئی تھی۔

مال روڈ پر سائے طویل ہو چکے تھے اور اب سڑک عبور کرنے کے لیے
بائیں ایک مرتبہ دیکھنا ضروری تھا —

ظاہر ہے وہ اُس سپاٹ پر تو نہیں تھی۔

"اُن کا رُخ ہائی کورٹ کی جانب تھا —" مُش نے کہا اور وہ چاروں نادان
طرح ہر شے سونگھتے ہوئے چلتے گئے۔ ہر دوکان کے اندر جھانکتے ہوئے اور ہر ذی
نظر میں رکھتے ہوئے... اور پھر اُنہوں نے اُسے دیکھ لیا اور اُن سب کو بھی ایک دھچکا
وہ وہی لگتی تھی۔ وہ امپیریل شوز کے نیم تاریک اور طویل شو روم میں لمبی اور نفیس
ایک دوسرے کے اوپر دھرے ہولے ہولے ہلا رہی تھی اور زری کے کام والے
کھُسّے دیکھ رہی تھی۔ وہ چاروں جھکے جھکے اُس نیم تاریکی میں چلے جیسے کسی معبد
ہیں اور اپنی اپنی آٹوگراف بکس کھول کر اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے "آٹ
پلیز —"

اُس نے پہلے تو سخت ناگواری سے اس دخل اندازی کو محسوس کیا اور
سامنے چار بیوقوف سے پلّے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

اُس نے اپنی خوبصورت ران پر مشاہد کی آٹوگراف بک رکھی اور مشاہد
وقت اپنی آٹوگراف بک تھام رکھی تھی اور اسی لیے اُس کی چھوٹی اُنگلی اُس کی ران
دیر رہی جتنی دیر میں اُس نے اپنا نام لکھا — ایوا گارڈنر — وہ وہی تھی۔ اُن چار
دیکھا کہ امپیریل شوز کی چھت میں سے دُھند اُتر رہی ہے اور اُس کی سفیدی میں
چپلیں، زری کے کھُسّے روپوش ہو رہے ہیں اور اُس لمحے اُس نے ایک سگرٹ

کراشٹ وہ اُسی طرح کش لگا رہی تھی جیسے "سنوز آف کلی منجاروز" میں پیرس کے ایک
ائٹ کلب میں گریگوری پیک کو انہی نیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے لگاتی تھی۔ اب یہ
چاروں گریگوری پیک تھے نیکریں پہنے ہوئے اور ترچھے گورکھا ہیٹس میں... مسکراتے ہوئے
ور کبھی کبھار ناک سے شوں شوں کرتے ہوئے... تب اُس نے ایک اور کش لگایا اور
دھواں اُن کے چہروں پر چھوڑ کر کہا "ویل رن الانگ بوائیز —" اور بوائیز کو یکدم ہوش
آگیا —

"ہاؤ ڈی مَیم —" کمال نے اپنے گورکھا ہیٹ کے چھجے کو چھو کر کہا۔

وہ ہنس دی اور ہاتھ آگے کر دیا "ہاؤ ڈِی —"

باقی تینوں حضرات نے بھی باری باری ہاؤ ڈی مَیم — کہا اور مَیم سے ہاتھ ملایا۔

وہ چاروں اِمپیریل شوز سے باہر آئے تو اُنہیں مال روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے
نام لوگ کیڑے مکوڑے لگے۔

"مین اُس نے میری طرف ویسے ہی دیکھا تھا جیسے وہ پیک کو دیکھتی تھی —"
کمال نے اپنا چھوٹا سا سینہ پھلا دیا "میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے محبت میں مبتلا ہو گئی ہے"

یہ سٹیٹ منٹ مکمل سنجیدگی سے دی گئی تھی۔

"ناہ —" پیٹر نے اُس کے کندھے جھنجھوڑے "تمہیں پتہ ہے کہ مجھ سے ہینڈ
ک کرتے ہوئے اُس نے میرا ہاتھ ذرا سا دبایا تھا — آنسٹ ٹُو گاڈ —"

مشاہد بھی آسمانوں پر تھا "اگر ایوا مجھے کہتی کہ یہ سگرٹ پی لو تو میں قسم کھاتا ہوں
کہ میں سگرٹ پی جاتا —"

"چھوڑو مین — اُس روز جاوید اثر نے تمہیں اپنے ڈیڈی کی برانڈی چکھانے کی
وشش کی تھی اور تم نے سونگھ کر چھوڑ دی تھی —"

"وہ تو شراب ہوتی ہے —"

"ناہ —" کمال نے اپنی چپٹی ناک چڑھائی "اِٹس اے ڈرنک مین —"

"ہے گائیز —" پیٹر نے اپنا ہاتھ آگے کر کے ہتھیلی پھیلائی اور پھر اُسے ناک کے
ساتھ لگایا — "کیا تم نے اپنے ہاتھ سونگھے ہیں — مین اِن میں سینٹ کی سمیل ہے یار"

سب نے فوراً اپنے اپنے ہاتھ ناک سے لگائے — ایک ہلکی سی دُھندلے خوابوں
الی مہک تھی... کسی سینٹ کی — جو ایوا گارڈنر کے بدن سے منتقل ہو کر ان کے ہاتھوں

میں آ گئی تھی۔ یہ مہک اُس شب اُن کے خوابوں کے دھندلکوں کے اندر تک گ
کی بجائے وہ تھے جو کلی منجاروز کی برفوں کے سائے تلے اُسے یاد کرتے تھے اور و
در خواب سگرٹ کا کش لگا کر اُن کے چہرے پر چھوڑتی تھی۔ اور اُس کے پورے
وہی مہک تھی۔ اگلی صبح وہ پھر نم موسموں میں تھے اور بستروں میں سے نکلتے ہوئے
تھے۔

اور اگلی صبح لاہور کے بُرج میناروں اور سارے باسیوں کو خبر ہو چکی تھی
ماسٹرز کے ناول "بھوانی جنکشن" کی فلم بندی کے لیے ہالی وڈ کی ایک ٹیم شہر میں۔
اور ایوا گارڈنر اور سٹیورٹ گرینجر شہر میں ہیں — "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے
فرنٹ پیج دیا اور اُن کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں بڑے اہتمام سے شائع کیں۔ پر
معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ کیپشن پڑھے بغیر یہ جاننا مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے ایوا کو
اور سٹیورٹ کونسا ہے —

اور ہاں یہی چار مسکیٹرز لاہور کے کولونیل لیفٹ اوور فلیٹیز ہوٹل میں ا
آٹوگراف بکس سے لیس ہو کر پہنچے اور لان میں چار بجے کی چائے نوش کرتے ہو
سائڈ برنز والے ڈیشنگ اور ہسکی آواز والے گرینجر کے سامنے "ہاؤ ڈی مسٹر —
ہوئے کھڑے ہو گئے۔ گرینجر نے نہ صرف یہ کہ اُن کے ساتھ باہمی دلچسپی کے ا
تبادلۂ خیال کیا بلکہ آٹوگراف دینے کے علاوہ اُنہیں ایک ایک کپ چائے کا بھی پیش کر
"دیٹ اِز مائی نائس آف یو مسٹر —" اُنہوں نے رخصت ہوتے ہوئے جو
اُس کا شکریہ ادا کیا۔ گرینجر کی گہری اور پاٹ دار ہنسی اُنہیں ہوٹل کے گیٹ تک چھ
آئی —

اگلے چند روز اُنہوں نے بھوانی جنکشن کی ٹیم کا پیچھا کرنے میں گذارے —
اُنہیں جب بھی موقع ملتا وہ ایوا کے سامنے آ کر فوراً ہیٹ کے چھجے کو چھو
ڈی مَیم —" کہتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ گرینجر کو بھی دن میں کم از کم تین چار
"ہاؤ ڈی مسٹر" سے واسطہ پڑ جاتا...

یہ اُن کی دانش مندی تھی کہ ایک خاص لمحے میں اُنہیں یہ احساس ہو گیا
اُنہوں نے ایک مرتبہ اور ایوا کے سامنے جا کر "ہاؤ ڈی مَیم" کہا تو وہ اُنہیں جھانپڑ
کرے گی اور ایک دو نہیں بلکہ متعدد — ادھر گرینجر صاحب کا بھی ناک میں دم آ چکا

اور وہ بھی طیش میں آ سکتے تھے — وہ اُن کا پیچھا تو بدستور کرتے رہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اب اُن کی نظروں میں نہ آئیں۔

بھوانی جنکشن کی آمد نے لاہور ریلوے سٹیشن کا چہرہ مُہرہ بدل دیا۔ عمارت کے ماتھے پر تانگہ سٹینڈ کے عین اوپر "لاہور" کی بجائے "بھوانی جنکشن" پینٹ کر دیا گیا۔ جہاں جہاں سائن بورڈ تھے اُن پر بھی اس نامانوس شہر کا نام لکھا گیا۔ پلیٹ فارموں پر ایکسٹرا اداکار لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی دھوتیاں اور نہرو ٹوپیاں پہن کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے رہتے۔ نہرو اگرچہ اتنا پسندیدہ نہ تھا لیکن اُس جیسی ٹوپی پہن کر چند ڈالر بنا لینے میں کیا حرج تھا۔

ایک روز لکشمی مینشن کے عین سامنے ایک عمارت کو آگ لگا دی گئی... بھوانی جنکشن کا ایک منظر — پریشان حال دُھویں میں کھانستی ایوا گارڈنر چھت پر بھاگ رہی ہے اور مدد کو پکار رہی ہے... ادھر پورا مینشن اس اوپن ایئر ڈرامے کو دیکھنے کے لیے کوٹھوں پر اُمڈا ہوا ہے.. مشاہد اپنے فلیٹ کی چھت پر، منڈیر کے اوپر جھکا ہوا ایوا کی المیہ اداکاری کو ایک عجیب اُداسی کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ گلی کے پار سمیعہ کو بھی چھت پر آنے کا موقع مل گیا ہے اور وہ بار بار مشاہد کو اشارے کر رہی ہے لیکن وہ تو مگن ہے — پورے بدن کی ایوا کے سامنے بھلا سمیعہ بے چاری کی کیا حیثیت — اُس کی حیثیت تو ابھی پوری طرح ڈیولپ بھی نہیں ہوئی تھی۔

بھوانی جنکشن کی ٹیم چند ہفتوں بعد شوٹنگ مکمل کر کے ہالی وڈ واپس چلی گئی۔

لاہور شہر ایک مدت تک اس صدمے سے سنبھل نہ سکا۔

اس کے آسمان میں روشنی کم ہو گئی۔

مال روڈ پر چلنے والے تانگوں کے گھوڑے اب قدرے سُست ہو گئے۔

تم ہندو ہو تو ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے بُندو رام؟ —

بُندو رام ہنسا — وہ اس سوال کو سُن کر ہمیشہ ہنستا تھا اور یہ سوال رنگ محل مشن اسکول سے واپس آتے ہوئے بچوں میں سے کوئی ایک بچہ روزانہ پوچھتا تھا...

اُس کے بوڑھے دانت میلے تھے اور کہیں تھے اور کہیں نہیں تھے اور اُن پر تمباکو زردی تھی... کوئی بچہ اُس کی بودی پکڑ کر ہولے سے کھینچتا... اُسے تکلیف دینے کے نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ اُترتی ہے یا نہیں.. ذرا بندو رام کو چھیڑنے کے لیے۔

مُبندو رام اس پر بھی ہنستا — اور اپنی بودی کو دیر تک سہلاتا رہتا۔

پاکستان بن چکا تھا۔ شاہ عالمی کی عظیم آگ جس نے لاہور کے آسمان کو کئی روز تک سُرخ کیے رکھا تھا اور جلے ہوئے بہی کھاتوں، کتابوں اور کپڑوں کے پَرکٹے سیاہ پرندے اُڑائے تھے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ رنگ محل چوک سے لے کر تقریباً پون میل کے فاصلے پر واقع شاہ عالمی چوک تک جو قدیم رہائش گاہیں، حویلیاں، عبادت گاہیں اور دوکانیں تھیں — اب وہاں نہیں تھیں۔ اُن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اونچے نیچے ٹیلوں اور ملبے کے ڈھیروں کا ایک سلسلہ تھا جن میں چھوٹی اینٹ کی کوئی ایک دیوار کہیں نظر آ جاتی۔ کوئی منقش دروازہ جلی ہوئی حالت میں کسی ڈھیر میں سے جیسے باہر آنا چاہتا ہو۔ مشن سکول کے بیشتر بچوں کا محبوب مشغلہ ان ڈھیروں پر چڑھنا اور دُھول میں اَٹ جانا اور پھر اپنی ماؤں کی مار کھانا تھا۔ ملبے کے ان بلند ڈھیروں میں سب سے نمایاں وہ آہنی تجوریاں تھیں جن پر آگ اثر انداز نہ ہو سکی تھی اور وہ عجیب آڑے ترچھے زاویوں میں ساکت ہو چکی تھیں۔ مشاہد کسی ٹیلے کے بیچ میں سے چلتا ہوا اُوپر دیکھتا تو اُوپر کوئی نہ کوئی تجوری ایسے نظر آتی جیسے ڈوبنے سے پیشتر جہاز ترچھا ہو جاتا ہے — شاہ عالمی کے ملبے میں نمایاں یہ ڈوبتے اس لیے ابھی تک وہاں تھے کہ اُس زمانے میں اتنی بھاری چیز کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے کوئی مشینری موجود نہ تھی۔ اور ان کھنڈروں میں کوئی ریڑھا یا ٹرک وغیرہ لے آنا ممکن نہ تھا۔ لوگ نہایت دل جمعی سے ان کھنڈروں میں بیٹھے لوہے کی سلاخوں کو کھرپیوں کی مدد سے مٹی کو کھودتے رہتے۔ یہاں کبھی سُنیارے تھے، سونے والے تھے کبھی کوئی چُوڑی نکل آتی اور کبھی کوئی جلی ہوئی بندیا — اور کبھی کوئی جلا ہوا ہاتھ۔

یار یہ شکل سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے تو ہندوؤں کو جا کر چھریاں مارتے ہیں تو یہ کیسے پتہ کرتے ہیں —

زاہد کالیا جس کا باپ پھیری لگا کر پکے برتن بیچتا تھا اندرون شہر کا رہنے والا تیز طرار بچہ تھا اور بہت علم والا تھا اور یقیناً اُسے بہت سے ہاتھ لگ چکے تھے اور مشاہد سمجھ میں جو کچھ نہ آتا تھا وہ اُسی سے پوچھتا تھا۔

یہ پتہ ہے کس طرح پتہ کرتے ہیں کہ یہ ہندو یا ہے مسلمان؟

کس طرح؟

اُس کی پُھلو دیکھ کر —

نہیں یار — مشاہد شرما گیا۔

ہاں بھائی ہماری چُھلو کٹی ہوتی ہے اور ان کی ویسے کی ویسی ہوتی ہے۔ بے شک
ب کر لو۔ مشاہد کو چیک کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ آگاہ تھا۔ یہ بہت دن پہلے کا
نوعہ نہیں تھا کہ اُسے ابراہیم نائی کے سامنے گھر کی چھت پر دو اینٹوں پر بٹھا کر کہا گیا تھا اور
ہنے سے پہلے اُسترے کو ایک خاص زاویے پر معلق کیا گیا تھا اور کہا یہ گیا تھا کہ مشاہد اُوپر
یکھو چیل گدھا اُٹھائے جا رہی ہے — اور مشاہد بے چارے نے بے اختیار اُوپر دیکھا تھا
ر اُسی لمحے نیچے سے کام تمام کر دیا گیا تھا —

اُسے چیک کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی — وہ آگاہ تھا۔

شاہ عالمی کو جن جیالوں نے جلایا تھا وہ اس معجزے پر سر دُھنتے تھے کہ بازار کے
ن درمیان میں لال مسجد کو آگ نے چھُوا تک نہیں تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ آگ
ں مسجد کی دیواروں کو چھُو کر پیچھے ہو گئی تھی۔ ویسے شاہ عالمی چوک میں ایک نہایت دیدہ
یب سنہری کلس والا مندر بھی آگ سے بچ گیا تھا لیکن یہ تو کوئی قابل ذکر بات نہ تھی...
شاہد سکول سے واپسی پر شاہ عالمی کے کھنڈروں میں کوہ پیمائی کرتا جب اس مندر کے قریب
پہنچتا تو وہاں رُک جاتا۔ جلے ہوئے مکانوں اور ایک بے آباد چوک کو اُس مندر کی عمارت
ب توازن دیتی تھی۔ وہ دیر تک سر اُٹھائے اُس کے سنہری کلس کو دیکھتا رہتا اور پھر مجرم سا
سوس کرتا اور جھینپ جاتا۔ اس چوک سے ذرا آگے وہ مسجد تھی جسے ایمان کی حرارت
لوں نے شب بھر میں بنا ڈالا تھا —

مسجد اور اُس مندر کے علاوہ رنگ محل چوک سے ذرا پہلے محمود کے ایاز کی قبر کے
یب ایک گلی کا چھوٹا سا حصہ ابھی تک موجود تھا۔ دو چار مکانوں کے ماتھے ابھی تک قائم
ے لیکن ان ماتھوں میں جو دروازے اور کھڑکیاں تھیں اُن میں صرف آسمان تھا۔ اُن کے
یچھے کچھ نہ تھا۔ جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہو اور شوٹنگ مکمل ہونے پر ویران ہو گیا ہو۔

بُندو رام اِسی گلی میں ایک ٹوٹی کھٹارا چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا رہتا تھا... صرف ایک
دھوتی میں ملبوس — اور بُندو رام تم تو ہندو ہو تو پھر ہندوستان کیوں نہیں جاتے... اور وہ
پنے تمباکو کی زردی والے دانتوں کے ساتھ ہنسنے لگتا — اوئے یہ میرے گھر کا دروازہ ہے
ا تو اس کے اندر بھی نہیں جا سکتا ہندوستان کیسے جاؤں — ذرا دھکیل کر دیکھو۔
ابا شے۔

اور کوئی بچہ آگے بڑھ کر دروازے کو دھکیلتا تو کہیں سے کوئی اینٹ نیچے آ
اور وہ پیچھے ہٹ جاتا۔

اِس کے پیچھے کچھ نہیں ہے — ہندو خوش ہو کر کہتا — پر میں نے راکھی تو
ہے ناں اپنے گھر کی —

پورے لاہور میں شائد وہ اکیلا ہندو تھا جو اُس گلی میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پ
— باقی سب جا چکے تھے — اور اُن کی جگہ لینے کو اُدھر سے لوگ آ چکے تھے۔

اور اُن کی جگہ لینے کو جو لوگ اِدھر آ چکے تھے اُنہیں پناہ گیر کہا جاتا تھا۔

اُن پناہ گیروں کی شکلیں ایسی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا اداکار اُن جیسی
بنانے پر قادر نہیں تھا — ہزاروں برسوں سے کسی گھر میں رہنا۔ آس پاس کے ویرانوں
قبروں سے آباد کرنا — پھر اُن گھروں کو ایک تنکا اُٹھائے بغیر چھوڑنا — پھر بھوک دُکھ
بیماری اٹھا کر چلتے جانا اور اپنی ماؤں کو — بیٹیوں کو بھی ننگے بدن دیکھنا بہت کچھ دیکھنا
کچھ نہ کر سکنا — بچوں کو کرپانوں میں پروئے دیکھنا اور کچھ نہ کر سکنا — بھوک
بیچارگی اور موت سے بے شرم ہو جانا... تب جا کر کچھ کچھ ویسی شکل بنتی ہے جو ان
گیروں کی تھی — یہ تو بنائے نہ بنے —

یہ پناہ گیر ہر صبح گوالمنڈی میں واقع چوہدری اللہ داد خان کے گھر کی بالکونی تلے
ہو جاتے اور اُوپر دیکھنے لگتے۔ اُن تک خبر پہنچتی تھی کہ اللہ داد کے پاس کرشنا گلی، گو
ارجن نگر اور گاندھی سکوئر میں ہندوؤں اور سکھوں کے مقفل مکانوں کی چابیاں مو
ہیں۔

بالکونی میں چک کے ساتھ لگی آپا جی اُن کو دیکھتیں اور وہیں سے غسل خانے
نہاتے اللہ داد کو آواز دیتیں "میں نے کہا — وہ آ گئے ہیں۔"

اور چوہدری اللہ داد خان جن کو پانی سے اور نہانے دھونے سے مریضانہ حد
لگاؤ تھا ڈونگا رکھ کر بالٹی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر پر اُنڈیل لیتے اور کہتے "اوہ تیرا
ہو جائے —"

آپا جی جب بہت غصے میں آتیں تو مشاہد کو چوڑا، گگڑا اور پناہ گیر کے القابا
سے نوازتیں اور ابا جی اوّل تو ٹھنڈے مزاج میں ہی رہتے اور اگر مجبوراً اُنہیں ناراض
پڑتا تو وہ گھور کر کہتے "اوہ تیرا بھلا ہو جائے —" وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے تھے۔

اُن کے پاس چابیاں نہیں تھیں — ایک چھوٹی سی ہتھوڑی تھی جس میں خوبی
تھی کہ وہ ہر قسم اور ہر سائز کے تالے کو کھول سکتی تھی۔ ایک خاص زاویے سے ایک
لکی سی ضرب اور تالے کی زبان باہر آ جاتی اور مُنہ کھل جاتا۔

اللہ داد دی بیگ پاپیر ہتھوڑی ہاتھ میں لیے آگے آگے اور ہجومِ پناہ گیراں پیچھے
پیچھے — کرشناں گلی صرف ایک گلی نہ تھی، ریلوے روڈ، بانساں والا بازار اور چیمبرلین روڈ
کے درمیان رہائشی مکانوں، حویلیوں اور گوداموں کا ایک بہت بڑا سینڈوچ تھی جس میں
ی آبادی ہندوؤں کی تھی۔ فسادات کے آغاز میں اُنہوں نے اِس علاقے سے باہر آنے
الے تمام راستوں کو لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے مضبوط دروازوں سے مہربند کر دیا
ا — اُنہیں یقین تھا کہ لاہور ہندوستان کا حصّہ بنے گا اور وہ اس یقین کے تحت اپنی
ھتوں پر سے آس پاس کی مسلمان آبادی پر وقتاً فوقتاً فائرنگ بھی کرتے رہتے تھے —
لیکن لاہور، پاکستان ہوا اور اس لاہور میں کرشناں گلی کا جزیرہ کب تک محفوظ رہتا — ہندو
بادی اپنے گھر چھوڑنے لگی، وہ رات کی تاریکی میں اپنے آبائی محلے سے نکلتے ایک اور
ین کے ساتھ کہ وہ واپس آئیں گے۔

کرشناں گلی کا پورا علاقہ اب ویران تھا۔ بہت کم لوگ اس کے اندر جاتے تھے۔ ہر
روازے پر تالا دکھائی دیتا۔

اللہ داد اور پناہ گیر جب کرشناں گلی کے اندر پہلا قدم رکھتے تو سب کے سب چُپ
جاتے... اُنہیں ہر دم یہی خدشہ رہتا کہ آہنی دروازے اُن کے پیچھے بند ہو جائیں گے یا
آ جائیں گے اور کہیں گے کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو لیکن ہتھوڑی کی پہلی ضرب سے،
لے تالے کا منہ کھلنے تک یہ سہم رہتا اور پھر اُن سب کو اپنے گھر یاد آ جاتے اور پھر اُن
گھروں کو دیکھنے لگتے جو اُن کے ہو سکتے تھے۔

رواج یہ تھا اور وہ سب جانتے تھے کہ جب اللہ داد تالا توڑے گا تو پھر پیچھے مڑ کر
م کو ایک نظر دیکھے گا۔ اور اُس ایک نظر میں جان جائے گا کہ اُن میں سے کس نے کیسے
ے دُکھ جھیلے ہیں، کون ہے جو ایک ایسا ہی گھر اُدھر چھوڑ کر آیا ہے اور وہ صرف اُسی کو
ارہ کرتا کہ آگے آ جاؤ یہ گھر تمہارا ہے۔

جتنے بھی جھجک والے تھے جو ہجوم میں ظاہر ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور
ن کے پیچھے بے چارگی اور شرمندگی سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے چلتے تھے اللہ داد

پہلے اُنہیں آباد کرتا — اور وہ ان گھروں میں ایسے جاتے جیسے بن بلائے مہمان ہو
مجبوراً ایک دو راتیں بسر کرنے کے لیے آ گئے ہوں۔

لیکن ایسے بھی تھے جو مکانوں کی آرائش اور بناوٹ دیکھ کر خوفزدہ ہو جا
اندر جانے سے انکار کر دیتے۔

اور کچھ اُن میں فاتحین کی طرح داخل ہوتے جیسے وہ اُن کی کھوئی ہوئی جا
جس میں وہ واپس آئے ہیں۔

مشاہد کو اجازت تو نہ تھی لیکن وہ بھی اکثر پناہ گیروں میں شامل ہو کر اپ
کے پیچھے پیچھے چلا جاتا —

پہلی بار جب وہ ایک ایسے مکان کے اندر گیا تو ٹھٹک گیا۔ باورچی خانے کے
میں چند اَدھ جلی لکڑیاں تھیں۔ چولہے پر ایک ہانڈی دھری تھی۔ گھڑوں میں پانی تھا
کونے میں کوڑے کرکٹ کی ایک چھوٹی سی ڈھیری تھی اور پاس ہی ایک گنجا سا جھا
جانے سے پیشتر اُنہوں نے صحن میں جھاڑو دیا تھا۔ اُس کے مکینوں کی سانسیں ابھی
میں تھیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ مخل ہوا ہے —

جیسے ہزاروں برس پُرانا کسی فرعون کا ایک زیر زمین مقبرہ دریافت ہوتا۔
آسائشوں کے تمام سامان — وہی ہوا جس میں اُنہوں نے سانس لیے تھے۔ چرا
بجھاتے ہوئے دیوار کی کالک پر اُنگلیوں کے نشان — اُن کے جو ابھی ابھی وہاں
تھے۔

ایک کارنس پر کروشیے سے بنے ہوئے بہت بھلے لگتے ہوئے نئے نئے غلاف
وہ اُن میں سے ایک اُٹھا لایا اور آپا جی کو دے دیا۔ اُنہوں نے اسے ریڈیو کے اُوپر
شام کو ابّا جی آئے تو گھر کی سینکڑوں چیزوں میں سے وہ غلاف الگ ہو کر اُن کی نظر
آ گیا "یہ کہاں سے آیا ہے؟"

"مشاہد لے کر آیا تھا —"

"مشاہد کہاں سے لائے تھے؟"

"ہندوؤں کے گھر سے جی — اب نہیں لاؤں گا۔"

"تمہیں پتہ ہے کہ یہ لُوٹ مار کا مال ہے —"

"جی —"

"تمہیں پتہ ہے لیکن تمہاری ماں کو نہیں پتہ —"

اُنہوں نے آپا جی سے کچھ نہیں کہا۔ باورچی خانے سے چمٹا لائے اور کروشیے کے غلاف کو اُس کے ساتھ پکڑ کر اُس چولہے میں ڈال دیا جس پر آلو گوشت کی ہنڈیا بڑبڑا رہی تھی۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پناہ گیر دلیر ہوتے گئے اور اُنہوں نے تالے خود ہی توڑنے شروع کر دیئے.... ایک بابا جی اپنی دو تباہ حال بیٹیوں سمیت ایک مکان میں گئے.... شام کو اُن کی بیٹیوں نے نہایت چمچماتے ہوئے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور خوب لپ سٹک لگا رکھی تھی — بابا جی ایک شاندار حقہ پی رہے تھے اور مسلسل کھانستے تھے۔ اللہ داد نے حال پوچھا تو بابا جی کہنے لگے، بس بیٹا اس لیے کھانسی آ رہی ہے کہ تمباکو پینے کی عادت نہیں ہے۔

اللہ داد حیران ہوئے کہ پھر پیتے کیوں ہو؟

بابا جی نے مکان کے اندر اشارہ کر کے کہا، اس کے اندر دو کمرے چھتوں تک تمباکو سے بھرے ہوئے نکل آئے ہیں۔ اب پینا شروع کروں گا تو کہیں جا کر ختم ہو گا۔

ایک بڑی بی کے گھر میں فلش سسٹم جو ابھی اُن زمانوں میں کم کم تھا، برآمد ہو گیا۔ اُنہوں نے بے دھیانی میں زنجیر پکڑ لی اور جب ایک شور شرابے سے پانی آیا تو گھبرا کر گلی میں آ گئیں کہ "ادھر چینی کی ہانڈی میں سیلاب آوے ہے۔"

کچھ ایسے تھے جو گھروں میں مجرموں کی طرح بیٹھتے تھے۔ کسی شے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے... وہ بھی اس یقین سے آئے تھے کہ واپس جائیں گے۔ وہ ایسے ہی بھرے پُرے گھر چھوڑ کر آئے تھے... اور اب ان گھروں میں داخل ہو کر اُن میں بے یقینی کا دکھ آیا تھا۔

چند ہفتوں میں ایک بھی مقفل گھر باقی نہ بچا۔ بلند آواز سے آہ و زاری کرنے والے اکثر ایک گھر سے دوسرے گھر میں — اور دوسرے میں سے سب کچھ سمیٹ کر تیسرے گھر میں منتقل ہوتے جاتے اور پیچھے رہنے والے جو خاموش رہتے تھے اُن کے حصے میں فٹ پاتھ آئے تھے۔

اکتوبر کے آغاز میں ہوا یکدم سرد ہو گئی۔

والٹن کیمپ اور لاہور سٹیشن کے اردگرد لاکھوں لوگ بے سروساماں پڑے تھے۔

اللہ واڑ اب اُنہی پناہ گیروں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے کہ آپ کے پاس تو؛
ہے... کوئی کمبل، کوئی رضائی تلائی — کوئی کھیس اُن کے لیے جو ننگے آسمان تلے ہیں.
ہاں اب پناہ گیروں کو مہاجرین کہا جانے لگا تھا۔

کریدتے کریدتے کچھ بھی نکل سکتا تھا۔
یہ شاہ عالمی کے ماضی کے ساتھ ٹکن مٹی کھیلنے کے مترادف تھا۔
وہاں حویلیوں، مندروں اور تاریک گلیوں بازاروں کی بجائے سرما کے آ؛
دھوپ میں تاحد نظر کھنڈر تھے۔ چھوٹے بڑے ٹیلے — جل کر تباہ ہونے والی عمارت
حجم کے مطابق.... اگر ایک حویلی تھی تو اُس کا کھنڈر بلند اور اگر کسی غریب کی کٹیا او
عالمی میں صرف دولت والے ہی نہیں عام لوگ بھی رہتے تھے اور غریب کی کٹیا کا چھ
ٹیلا — اگر اس منظر کو فضا سے دیکھا جاتا تو یہ کچھ کچھ ہیروشیما کا حصہ لگتا — لیکن
بقیہ حصہ کسی حد تک سلامت تھا.. صرف شاہ عالمی کا نشان مٹا تھا۔
ان کھنڈروں میں ایک گلی کا ماتھا تھا جس میں مُندو رام کی چارپائی اور حقہ تھا۔
لال مسجد اور اس کی بلند سیڑھیاں تھیں اور اس کے آس پاس ویرانی تھی۔
یا پھر بانساں والے بازار والے چوک میں سُنہری کلس والا مندر تھا۔
یا پھر ٹیلے تھے جن میں سے کرسمس آئی لینڈ کے دیو پیکر پتھریلے اجسام کی
آہنی تجوریاں دور سے نظر آتی تھیں۔
ان ٹیلوں کو کُریدتے کُریدتے کچھ بھی نکل سکتا تھا۔
مشاہد نہایت احتیاط سے اُنہیں کریدتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ گھر پہنچنے پر آپا ج
کے ناخن چیک کریں گی اور اُن میں پھنسی ہوئی نیم سیاہ مٹی سے اندازہ لگالیں گی کہ د
بھی شاہ عالمی کے ملبے میں سے چیزیں تلاش کرتا رہا ہے اور اُن کے لیے بھی اس سے
کر معیوب بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ اُن کا بیٹا "لُوٹ مار" کی چیزیں تلاش
رہے — پناہ گیروں اور گگڑوں کی طرح..
چنانچہ وہ احتیاط کرتا تھا —
یہ ناممکن تھا کہ کوئی بھی بچہ مشن سکول سے باہر آکر سیدھا گھر چلا جائے۔ ش
کے ٹیلے اُن کے لیے ٹریژر آئی لینڈ تھے۔ وہ اس آئی لینڈ میں خزانے تلاش کرنے بیٹھ

ت اور زمانے سے غافل ہو جاتے۔

نکلتا بہت کچھ تھا لیکن ایسا کم نکلتا جو رکھنے سنبھالنے کے لائق ہوتا۔ پیتل کی چکی
ئی گڈویاں، بہی کھاتوں کے جلے ہوئے گتے، دیئے، مٹی کے ٹوٹے ہوئے بت اور ایسا
ت کچھ جس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا ہے۔

ایک چھوٹا سا ڈھیر ایسی چیزوں کا مشاہد کے ساتھ بڑا ہوتا جاتا تھا — اور پھر مٹی میں
ں ذرّہ لشکا۔ مشاہد نے اُس کے آس پاس کی مٹی پرے کی تو وہاں ایک سنہری کنگن کی
لائی کا کچھ حصہ تھا۔ اُس کے ماتھے پر بے پناہ پسینہ پھوٹا — یہ اُس کا پہلا خزانہ تھا۔

مشاہد خوشی سے بے دھیان ٹھوکریں کھاتا ہوا ٹیلے سے نیچے اُترا اور آس پاس
ت غور سے دیکھنے کے بعد کہ کسی نے اُسے دیکھا تو نہیں اُس نے کنگن کو جیب سے نکال
اپنی آنکھوں کے سامنے کیا — اصل مسئلہ اِسے چھپا کر رکھنا اور راز رکھنا تھا۔ وہ لُوٹ
کے مال کے بارے میں اپنے ابا جی کے جذبات سے آگاہ تھا۔ اُس نے کنگن کو جیب میں
ں کر اپنی ہتھیلی اُس پر رکھی، کنگن کی گولائی اُس کی ہتھیلی میں بریل کی عبارت کی طرح
ں ہوئی۔

سامنے بُندو رام کی گلی تھی۔ کسی فلم کا ٹوٹا ہوا سیٹ، کھلے کواڑ، کھڑکیاں اور روشن
ں جن میں آسمان اور مٹی کے ڈھیر۔ آج یہ گلی زیادہ ویران تھی۔ سکول کے بچے ادھر
ہو کر جا چکے تھے اور مشاہد ٹیلے پر بیٹھا وقت سے لاپرواہ ہوا تھا اور اُسے دیر ہو چکی
بُندو رام اپنے حقے پر جھکا بیٹھا تھا اور اُس کی چٹیا کے سفید بال ہوا میں اُٹھتے تھے۔ کیا
ں کی چُٹیا کھینچی جائے یا اِس سے پوچھا جائے کہ بُندو رام تم ہندو ہو تو ہندوستان کیوں
ں جاتے۔

اِس کی چُٹیا کھینچی جائے۔

وہ گلی کے ساتھ لگ کر اُس کی نظر سے بچ کر چارپائی کے پیچھے گیا۔ بندو رام کی
ن کے پیچھے، کندھوں کے درمیان میں بوڑھی پشت میں ایک سبزی کاٹنے والی سستی
ری کا دستہ پیوست تھا۔ چھری کے پھل کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا اور اُس پر سیاہ
ڑھی سی سرخی تھی اور اُس کی چوٹی کے سفید بال ہوا میں اُٹھتے تھے۔

"اوہ تیرا بھلا ہو جائے —" اللہ داد نے اپنے بیٹے کی سُوجی ہوئی آنکھوں اور گرد